R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29

Annual Rs 4/-

Per Copy -/12 P

Date

1-8-15-22

جلد ۲۵۔ شمارہ ۴۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ ؍ اکتوبر ۱۹۶۶ء

اداریہ

صدرِ جمہوریہ کا متوقع اعلان

خوشی کی بات ہے کہ مرکزی حکومت صدرِ جمہوریہ کو یہ مشورہ دینے پر آمادہ ہوگئی ہے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر اتر پردیش، بہار اور دلی میں اردو کو بعض خصوصی کاموں کے لیے سرکاری طور سے تسلیم کرلیں۔ انجمن نے سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں صدرِ جمہوریہ کو ایک یادداشت کے ذریعے اس طرف توجہ دلائی تھی۔ دوبارہ ۱۹۵۵ء میں یاد دہانی کی گئی اور صدر نے اپنی حکومت سے مشورہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے نتیجے میں وزارتِ داخلہ کی طرف سے ایک اعلان بھی شایع ہوا۔ مگر ریاستی حکومتوں نے باوجود اس اعلان کو تسلیم کرنے کے اور لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے بار بار توجہ دلانے کے نہ صرف اس پر پوری طرح عمل نہیں کیا، بلکہ ان شکایات کی بھی کوئی پروا نہیں کی جو مختلف اوقات میں اردو دوستوں کی طرف سے کی گئیں۔ یہ سستی اور غفلت ہر طرح جمہوریت کی روح کے منافی تھی اور جب سہ لسانی فارمولے میں بھی اپنی مادری زبان تیسری زبان کے طور پر پڑھنے کا اردو کی اقلیت کو موقع نہ ملا تو بے چینی حد سے بڑھ گئی۔ اب بھی حلقوں کی طرف سے اس زیادتی پر احتجاج ہوتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت صدرِ جمہوریہ کو مناسب مشورہ دینے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کے بنیادی مطالبے کی طرف پھر اشارہ کر دیا جائے۔ انجمن کا مطالبہ یہ ہے کہ اتر پردیش، بہار، پنجاب اور دلی میں اردو کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے تاکہ

(۱) ابتدائی تعلیم کی منزل پر ہر طالب علم جس کی مادری زبان اردو ہے، اپنی مادری زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرسکے۔

(۲) ثانوی تعلیم کی منزل پر اردو کے ذریعے تعلیم دینے کی تمام سہولتیں ہوں اور اس کے لیے اساتذہ کی تربیت اور درسی کتابوں کی تیاری کا پورا پورا انتظام ہو۔

(۳) عدالتوں اور دفتروں میں اردو میں کاغذات اور عرضیاں داخل کرنے اور ان کے جوابات اردو میں ملنے کی سہولت ہو۔ نیز فیصلوں کی نقلیں اردو میں مل سکیں اور رجسٹریاں اردو میں ہوسکیں۔

(۴) تمام سرکاری قوانین، اعلانات، قواعد اور نوٹس اردو میں بھی شایع کیے جائیں۔

(۵) سہ لسانی فارمولے میں مادری زبان کی تعلیم لازمی طور سے شامل ہو۔

(۶) ایسے ضلعوں یا شہروں یا میونسپل حلقوں یا تحصیلوں میں جہاں اردو داں آبادی تیس فی صدی سے زیادہ ہو اردو میں بھی سرکاری ریکارڈ رکھے جائیں۔

(۷) مقابلے کے امتحانوں میں ہندی کا پرچہ لازمی طور سے شامل نہ ہو بلکہ ملازمت میں مستقل ہونے کے لیے ہندی میں پاس ہونا لازمی ہو۔

(۸) اردو کے ادیبوں کی مناسب حوصلہ افزائی کی جائے اور اردو کی اچھی کتابوں پر معقول تعداد میں انعامات دیے جائیں۔

اگر صدرِ جمہوریہ کے اعلان میں ان تمام باتوں کی وضاحت ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ اردو دوستوں کی بیجا شکایات دور ہو سکتی ہیں اور وہ قومی زندگی میں اور جوش و خروش سے حصہ لے سکتے ہیں اور قومی یک جہتی کو مستحکم کرسکتے ہیں۔ یہ کام بارہ برس پہلے ہونا چاہیے تھا۔ اس میں دیر ہونے سے بہت نقصان ہوگیا۔ اب بھی وقت ہے مگر اور تاخیر ہوئی تو اس سے پوری قوم کو بڑا نقصان پہنچے گا اور ملک کی ترقی اور جمہوریت کے فروغ میں اور دیر لگے گی۔ اردو کی ترقی سے ہندی کی بھی ترقی ہوگی۔ اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے سے ہندی کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ بقول مولانا آزاد ہندی کو جو جگہ ملنی چاہیے تھی وہ مل چکی، اب اردو کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ حق و انصاف میں جتنی دیر ہوتی ہے اتنی ہی اس کی ساکھ کم ہوتی ہے۔ اب اس نیک اور ضروری کام میں دیر نہ ہونی چاہیے۔

آہ عبدالبصیر خاں

افسوس ہے کہ ۹ اکتوبر کو پچاس سال کی عمر میں ڈاکٹر عبدالبصیر خاں صدر شعبۂ حیوانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کینسر کے عارضے میں انتقال ہوگیا۔ سال بھر سے مرحوم اس مرض میں گرفتار تھے۔ آپریشن کامیاب ہوا تھا مگر مرض نے پھر زور کیا۔ ڈاکٹر عبدالبصیر خاں ایک ممتاز سائنس داں تھے اور یونیورسٹی اور علمی دنیا کی ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ ان کے استاد ڈاکٹر بابر مرزا کی ایک خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو اردو میں سائنسی موضوعات پر مضامین لکھنے کی تربیت

دی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالبصیر خاں بھی عام فہم انداز میں سائنسی موضوعات پر اردو میں لکھتے رہتے تھے۔ چند سال ہوئے ان کی کتاب "دیمک کی کہانی" انجمن نے شائع کی تھی اور یہ بہت مقبول ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عبدالبصیر خاں کی یونیورسٹی کی تہذیبی و ثقافتی زندگی میں بھی ایک نمایاں حیثیت تھی۔ اس کم عمر میں ان کا دنیا سے رخصت ہو جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ ادارہ ہماری زبان ان کے انتقال پر سوگوار ہے اور ان کے پس ماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

مجلس اردو سیفیہ کالج بھوپال کے زیر اہتمام انعامی تحریری مقابلہ

"مجلس اردو" سیفیہ کالج بھوپال کے زیر اہتمام انعامی تحریری مقابلہ ہو رہا ہے جس میں صرف بھوپال کے کالج کے طلبہ حصہ لے سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل عنوانات پر کامیاب مضامین لکھنے والے طلبہ کو تین انعامات اول، دوم، سوم کتابوں کی شکل میں دیے جائیں گے۔ پہلا انعام تیس روپے دوسرا انعام بیس روپے اور تیسرا انعام دس روپے کی قیمت کا ہوگا۔ اور منتخب شدہ مضامین نوائے سیفیہ بھوپال کے نمبر میں شائع کیے جائیں گے۔

عنوانات

۱۔ بھوپال کا عظیم فن کار ۲۔ ہندوستان کی ترقی میں بھوپال کا حصہ
۳۔ بھوپال کے لوک گیت ۴۔ بھوپال کی سماجی زندگی
۵۔ بھوپال کے دلچسپ مشاغل ۶۔ بھوپال کی مختصر تاریخ

شرائط

(۱) طلبہ ایک یا ایک سے زیادہ عنوانات پر طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ ہر مضمون کم از کم فل اسکیپ سائز کے پانچ صفحے کا ہونا چاہیے (۲) مضمون کاغذ کے ایک صفحے پر صاف اور خوشخط لکھا ہوا ہونا چاہیے۔ کٹے پھٹے مضامین رد کر دیے جائیں گے (۳) مضامین وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۵ نومبر ۸۶ء ہے۔ اس کے بعد آنے والے مضامین مقابلے سے خارج سمجھے جائیں گے۔ (۴) مضامین بذریعہ ڈاک یا دستی دیے جا سکتے ہیں (۵) مجلس اردو کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جائے گا۔ (۶) مضامین صدر شعبہ اردو کے ذریعہ آنا چاہیے۔ (۷) مضامین نگراں یا سکریٹری مجلس اردو سیفیہ کالج بھوپال کے نام ارسال کیے جائیں۔ (سکریٹری عبدالحمید کامل بھزادی)

اردو کے ایک مصنف کو راجستھان ساہتیہ اکاڈمی کا انعام

جے پور ۱۱ اکتوبر۔ راجستھان کی سرکاری ساہتیہ اکاڈمی نے اس سال پانچ پانچ سو روپے کے چار انعامات ہندی، اردو، راجستھانی اور سنسکرت زبان کے مصنفوں کو دیے ہیں۔ ہندی کا انعام ڈاکٹر گووردھن کو ملا ہے اور اردو کا انعام حمید اللہ خاں صاحب کو ان کی اس اردو کتاب پر ملا ہے جو ادب اطفال سے تعلق رکھتی ہے۔

پنجابی لوک گیت اور آرٹ، پنجابی یونیورسٹی جمع کرے گی

پٹیالہ۔ ۱۲ اکتوبر۔ پنجابی یونیورسٹی نے پنجاب کے لوک گیتوں اور آرٹ کو جمع کرنے کی پہلی بار منظم کوشش کی ہے۔ پنجاب کے لوک گیتوں کو جمع کرنے کی ابتدا گذشتہ برس امریکی پروفیسر ڈاکٹر ڈی ایچ۔ ایل کارنے کی جب انھوں نے دیہات کا دورہ کر کے پنجابی لوک گیت اکٹھے کیے۔ اب پنجاب کی لوک کتھاؤں کو بھی جمع کیا جا رہا ہے۔ پنجابی یونیورسٹی پنجابی زبان کے مشہور ادیبوں کے کل کارناموں کو بھی جمع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جب یہ کارنامے جمع ہو جائیں گے تو ریسرچ اسکالروں کے لیے بہت بڑی دلچسپی کا موجب بنیں گے اور انھیں یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھ دیا جائے گا۔ اس لائبریری میں پنجابی ادیبوں کے قلم، کرسیوں اور میزوں کو بھی لا کر رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

اختر شیرانی پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ وکرم یونیورسٹی اوجین نے جناب یونس حسنی لیکچرر شعبہ اردو مادھو کالج (وکرم یونیورسٹی) اوجین کو اردو کے مشہور و منفرد رومانی شاعر و ادیب اختر شیرانی پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یونس صاحب نے اپنا تحقیقی مقالہ ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی نگرانی میں لکھا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ مقالہ جلد ہی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے گا۔

کشمیر میں اردو کتابوں کی کل ہند نمائش

لکھنؤ۔ ۱۵ اکتوبر۔ ایک خبر کے مطابق کشمیر میں سری نگر یونیورسٹی کے زیر اہتمام اس کے احاطے میں ۲۰ اکتوبر سے اردو کتابوں کی کل ہند نمائش شروع ہونے والی ہے۔ یہ نمائش جس کا افتتاح لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کریں گے ۲۰، ۲۱، ۲۲ تین دن رہے گی اور توقع ہے کہ اس میں ملک بھر کے اردو کتابوں کے ناشر شرکت کریں گے۔

ممتاز مصنف پریسٹلے نے اپنی کتاب کی رائلٹی آکسفام کو دیدی

لندن۔ ایک اطلاع کے مطابق ممتاز مصنف جے۔ بی۔ پریسٹلے نے اپنی ایک نئی کتاب کی ساری رائلٹی برطانیہ کی فلاحی تنظیم آکسفام کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مسٹر پریسٹلے نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ آکسفام دنیا بھر میں بھوک اور غم و الم کو کم کرنے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دے رہی ہے ان کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ اس تنظیم اور ان مردوں اور عورتوں کو جنھوں نے اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر رکھا ہے خراج تحسین پیش کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ میں یہ کتاب اور اس کے تمام حقوق اسے تحفتاً پیش کر دوں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے پبلشر بھی اس تنظیم کو امداد دے رہے ہیں۔

یہ کتاب مسٹر پریسٹلے کے مضامین، لیکچروں وغیرہ کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے موسیقی کے اصولوں سے لے کر تمباکو تک کے موضوعات پر اپنے خیالات اور شکوک کا اظہار کیا ہے۔ (خلافت، بمبئی)

سید مسعود حسن رضوی ادیب

فارسی اور اردو کا ایک فرانسیسی

ادیب اور شاعر

نجم الغنی کا بیان ہے کہ ۱۲۵۰ھ میں نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے چند یورپین مصاحبوں کو ان کی گستاخی کی بنا پر اپنے دربار سے نکال دیا۔ اس سے چند سال پہلے ایک فرانسیسی صاحب پٹریک فورتیر پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ اس نے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فرانس کے مشہور عالم، شاعر اور مصنف وولٹیر کی کتاب زادیگ کا فارسی میں ترجمہ کیا بادشاہ کے علمی ذوق پر اعتماد کر کے اس کو کامل امید تھی کہ اس کی یہ علمی خدمت عفو قصور کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس نے کتاب کا جو دیباچہ لکھا ہے اس کا بہت مختصر خلاصہ اسی کے لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے۔[1]

"مترجم این کتاب پٹریک فورتیر از قوم فرانسیس ....
... است۔ از ابتدائے سن شعور تا رسیدن بہ سی
و چہار سال در .... خدمات عمدہ بسر بردہ و لکہا
روپیہ بہم رسانیدہ .... ناگاہ فلک کج رفتار
...... بہار باغ عشرتم را بہ تاراج بردہ ...... تا آنکہ
...... امکنۂ علیا و جاگیر و غیرہ را گزاشتہ ......
وارد دار السلطنت لکھنؤ گردیدم .... در سال سال
.... یک ہزار و دو صد و چہل و پنج ہجری در زمرۂ
خادمان و مصاحبان سلطان دارا دربان ......
نصیر الدین حیدر .... شرف امتیاز دریافتہ ......
عرصۂ یک سال در بارگاہ .... آن گیتی پناہ حاضر
بودہ .... بعد از ...... نیرنگی زمانۂ ناہنجار ....
...... سر رشتۂ ملازمی و ندیمی چنین خدیو والا تبار ..
..... از دستم رفتہ .... چون گزرانیدن نذورات
.... در بارگاہ .... چنین خدیو سعدت آرا ....
... بر جمیع ...... خدام جاں نثار واجب و متحتم است
لہذا این اقل العباد قصہ ہائے زادیگ را کہ ......
مسمی وولٹیر شاعر در زبان فرانسیس بہ حیز تحریر آوردہ
بود ..... برائے نذر خدیو والا جاہ ترجمۂ آن بہ زبان
فارسی نمودم ..... در تحریر ترجمہ بسا مشقتہا بردا شتم
و این را وسیلۂ این سعی انگاشتم کہ سلطان عادل ....
باز حقیر را در زمرۂ ملازمان و ندیمان شرف امتیاز بخشد
.... امید واثق می دارد کہ این ہدیہ بدیعہ ما و قتیکہ
از نظر کیمیا اثر خواہد گزشت نخل تمنائے ما .... بار
بار آور .... خواہد شد .... و این قصہ را مرتب
کردہ شدہ بہ نوزدہ فصل و یک خاتمہ۔"

خلاصہ مطلب یہ کہ اس کتاب کا مترجم پٹریک فورتیر فرانسیسی سن شعور سے چونتیس برس کی عمر تک عمدہ خدمتیں انجام دیتا رہا اور لاکھوں روپیہ پیدا کیا۔ ناگاہ فلک کج رفتار نے میرے باغ عشرت کی بہار لوٹ لی۔ یہاں تک کہ میں بڑی بڑی عمارتیں اور جاگیر وغیرہ چھوڑ کر لکھنؤ میں وارد ہوا اور اسی سال ۱۲۴۵ھ میں نصیر الدین حیدر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ ایک سال کے بعد نیرنگی زمانہ سے وہ ملازمت ختم ہو گئی۔ چونکہ بارگاہ شاہی میں نذریں پیش کرنا جاں نثار خادموں پر واجب ہے لہذا میں نے زادیگ کے قصے جو وولٹیر نامی شاعر نے فرانسیسی زبان میں لکھے ہیں، بادشاہ کو نذر دینے کے لیے فارسی میں ترجمہ کیے۔ ترجمے میں بڑی محنت کی اور اس کو اس مقصد کا وسیلہ سمجھا کہ بادشاہ مجھ کو پھر ندیموں کے زمرے میں ملازم رکھ لیں گے۔ امید واثق ہے کہ جب یہ نادر ہدیہ نظر کیمیا اثر سے گزرے گا تو میرا نخل تمنا پھر بار آور ہو گا۔ یہ قصہ ۱۹ فصلوں اور ایک خاتمے پر ترتیب دیا گیا۔

خاتمے میں ۲۶ شعر کی ایک مثنوی ہے جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:

چو در تاریخ سالش فکر کردم
ز ہاتف این ندا ناگہ شنیدم
رقم شد قصہ زادیگ چوں خوب
بجو تاریخ او از لفظ مرغوب

۱۲۴۸ھ

قصہ زادیگ کا قلمی نسخہ جو میں نے دیکھا ہے اس میں بڑی تقطیع کے ایک سو پانسٹھ صفحے ہیں۔

پٹریک فورتیر نے وولٹیر کی دوسری کتاب "قصہ میمنوں" کا فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ کر کے محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا۔ مترجم اس سے پہلے اسی مصنف کی کتاب "قصہ زادیگ" کا فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ کر کے نصیر الدین حیدر کو نذر کر چکا تھا۔ ان دونوں کتابوں کے دیباچے کی عبارتیں بہت کچھ ملتی جلتی ہیں اور بہت سے جملے اور فقرے دونوں میں یکساں ہیں۔

اس کتاب کا ایک خوبصورت خوشخط مطلا نسخہ راقم نے دیکھا ہے جو اصل کتاب کے فارسی اور اردو ترجموں پر مشتمل ہے۔ فارسی ترجمہ متن میں ہے اور اردو ترجمہ حاشیے پر۔ اردو ترجمے میں وہ لفاظی اور عبارت آرائی نہیں ہے جو فارسی ترجمے میں ہے۔ فارسی اور اردو دونوں عبارتوں میں انھیں زبانوں کے بہت سے اشعار جگہ جگہ موجود ہیں۔ یہ اشعار خود مترجم ہی کے کہے ہوئے ہیں۔ خود فورتیر کا یہ کارنامہ

(باقی صفحہ ۔۔ کالم ۔۔ پر)

[1] تاریخ اودھ حصہ چہارم صفحہ ۳۲۲

اکبر علی خاں

کیا مرقع شعرا جعل ہے

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو اردو شاعروں کے ایک گم شدہ تذکرے کے چند اوراق ملے تھے۔ اس تذکرے میں حالات اور انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ شعرا کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ تذکرے کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا اس لیے کہ دریافت شدہ اوراق میں ابتدائی اور آخری اوراق نہ تھے۔ اندرونی شہادتوں سے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ تذکرے کا نام اس رعایت سے کہ اس میں شعرائی تصاویر کا التزام کیا گیا تھا مرقع شعرا رکھا گیا ہے۔

۲۔ تذکرے کا مصنف کوئی ہندو کایستھ ہے۔ ۳۔ تذکرے میں مرزا مظہر جان جاناں کی شہادت کا ذکر ہے اور میر کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترتیب کے وقت حیات ہیں۔ مرزا مظہر کی شہادت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں۔ اس لیے یہ تذکرہ ان دونوں سنوں کے درمیان تیار ہوا۔ ۴۔ اس تذکرے میں پروانہ لکھنوی، تسلی لکھنوی، حسرت دہلوی، ضیا دہلوی، فدوی لاہوری، قتیل فرید آبادی، مصحفی امروہوی، مضطر لکھنوی، مرزا جان جاناں مظہر اور میر تقی میر کی تصاویر ہیں۔ مولانا ابو الکلام کے الفاظ میں:

"اگر ان اوراق میں اور کچھ نہ ہوتا صرف میر تقی میر اور حضرت مرزا مظہر کی تصویریں ہوتیں جب بھی ان کی غیر معمولی قدر و قیمت کا ہمیں اعتراف کرنا"

میری طرف سے اس پر محقق کا اور اضافہ کیجیے۔ ان خصوصیات کا تقاضہ تھا کہ جو اوراق دریافت ہوئے تھے انہیں پورے سلیقے اور حسن کے ساتھ اردو کے شیدائیوں تک پہنچایا جاتا۔ چنانچہ مولانا ابو الکلام کی فرمائش پر رام بابو سکسینہ نے ان تمام اوراق کا عکس مرقع شعرا کے نام سے مع رنگین تصاویر کے بہترین آرٹ پیپر پر بلاکوں میں چھاپ دیا۔ اور اس طرح اصل مخطوطے کی صحیح شکل سامنے آگئی۔ چونکہ مخطوطہ دیمک کھایا ہوا اور آب رسیدہ ہونے کی بنا پر بعض مقامات پر دھندلا ہو گیا تھا اور عام پڑھنے والے کو پڑھنے میں دقت پیش آتی اس لیے عبارتوں کو اصل کے عکس کے ساتھ دوبارہ صاف ستھرا کتابت کرا کے شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ عکسی اشاعت ۱۹۶۱ء میں چھپی تھی۔ حال ہی میں یہ اشاعت میری نظر سے بھی گزری اور میں نے اسے بے حد اشتیاق کے ساتھ دیکھا لیکن غور سے دیکھنے پر مجھے اس کی بیشتر مشتبہ معلوم ہوئی اور بعض ایسی شہادتیں ملیں جن سے رام بابو سکسینہ اور مولانا ابو الکلام کے بیانات مشکوک ہو جاتے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے اس کی تصاویر کو دیکھ کر خیال آیا کہ ڈیڑھ سو سال پرانی تصاویر کا یہ انداز نہیں ہو سکتا۔ میں تجزیہ کر کے تو نہیں بتا سکتا کہ ان میں کونسی ایسی بات ہے کہ انہیں اتنا قدیم ماننے میں مجھے تامل ہے لیکن میں نے بہت سی پرانی تصویریں دیکھی ہیں ان کے دیکھنے سے ایک ذہنی معیار پیدا ہو گیا ہے جس سے کہ ان تصاویر میں کچھ نہ کچھ بناوٹ ضرور ہے۔ بہر حال تصاویر کی قدامت پر شک ہونے سے میری اتنی رہنمائی ضرور ہوئی کہ میں نے عبارتوں کے عکس کی طرف رجوع کیا۔ اور یہ دیکھا کہ طرز کتابت پر کس حد تک قدامت کی چھاپ ہے۔ اس مطالعے کے نتیجے میں میں نے مندرجہ ذیل ایسی باتیں نوٹ کیں جن کا وجود میر کے عہد سے پہلے خود میر کے عہد میں اور عہد میر سے کم از کم ساٹھ ستر سال بعد تک نہیں تھا۔

۱۔ پہلی وہ بات جو اس عہد کے خلاف مخطوطے کے طرز کتابت میں نظر آتی ہے یہ ہے کہ اس میں ہر جگہ یائے معروف و مجہول کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے حالانکہ یہ فرق اب سے نصف صدی یا اس سے کچھ ہی پہلے رواج پانا شروع ہوا تھا۔ کاتب کو اس حد تک یہ التزام منظور ہے کہ ایک آدھ مقام پر جہاں جگہ کم رہ گئی ہے اور یائے مجہول کی پوری گنجائش نہیں نکلی اس نے نصف یا ذرا کم لکھی ہے جو یوپی والوں کے نزدیک یائے مجہول کی شکل ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ ۳۰۔۴۰ برس ادھر تک اردو میں الف مقصورہ کے بعد نون لکھا جاتا تھا جیسے اٹھا کو اٹھنا، اس کو اس وغیرہ زیر بحث مخطوطے میں ایسے سارے مقامات پر پیش کا استعمال کیا گیا ہے جو اس کی غمازی کرتا ہے کہ اس مخطوطے کی کتابت اس وقت ہوئی جب اردو املا میں اصلاح ہو چکی تھی۔

۳۔ گاف کا دوسرا مرکز بھی عہد میر کے بہت بعد رائج ہوا لیکن اس مخطوطے کی فارسی و اردو دونوں تحریروں میں گاف پر دوہرے مرکز کا استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔ ث کی قدیم شکل ٹ ہے یعنی ت کے دو نقطوں پر دو مزید نقطے، ان نقطوں کی جگہ ط کا استعمال عہد میر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، یہ تبدیلی ایک صدی کے اندر اندر کی ہے مگر مرقع شعرا کے مخطوطے میں موجودہ شکل کے مطابق کتابت کی گئی ہے۔

۵۔ ہائے مخلوط کے لیے دوچشمی ھ کی شکل میر تو کیا غالب کے بھی بہت بعد مخصوص ہوئی ہے۔ قدیم تحریروں میں شوشہ دار ہ اور دوچشمی ھ دونوں گڈمڈ ملتی ہیں یعنی شوشہ دار کی جگہ دوچشمی اور دوچشمی کی جگہ شوشہ دار، جہاں جو شکل قلم سے نکل گئی موجودہ مخطوطے کے کاتب نے ہائے مخلوط کی جگہ پر تو ہائے شوشہ دار کا استعمال کیا ہے مگر اس کے برعکس کسی ایک جگہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ شوشہ دار کے بجائے دوچشمی لکھی ہو یعنی کہاں کو کھاں، مظہر کو مظھر، کہو کو کھو، یہی کو یھی، اور بہت کو بھت نہیں لکھا ہے مگر

پھیرا ہے کو پھیرا ہے۔ پھرتے پھرتے کو پہرتے پہرتے، بھلا کو بہلا، کچھ کو کچہہ وغیرہ لکھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے قلم سے شوشہ دار ہ کے مقام پر دوچشمی ھ نہیں نکلی یہ بات خود اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کاتب جدید املا سے متاثر ہے۔

۶۔ اور ان سب سے بڑھ کر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں علامت وقف کے لیے ایک دو جگہوں پر نہیں ہر جگہ ڈیش کا استعمال کیا گیا ہے۔ عہد میر میں تو نقطہ (۔) ہوتا تھا۔

چونکہ میرے سامنے اصل مخطوطہ نہیں صرف اس کا عکس ہے اس لیے کاغذ اور روشنائی کی عمر متعین کرنے میں جو سہولت ہوتی وہ میسر نہیں پھر بھی میری بیان کردہ وجوہ سے یہ مخطوطہ اٹھارہویں صدی کا تو کیا انیسویں کے اوائل کا بھی نہیں ہونا چاہیے۔

مرتب کتاب رام بابو سکسینہ یا مولانا ابو الکلام آزاد مخطوطات شناسی کے معاملے میں گہری نظر نہیں رکھتے تھے اس لیے میرا خیال ہے کہ اصل کتاب جس ذریعے سے ہاتھ آئی یہ اس کا جعل ہے۔ اس قسم کے واقعات ہندوستانی مصوری کے سلسلے میں اکثر و بیشتر پیش آتے رہتے ہیں اور بہت سے اشخاص باقاعدہ جعلی تصاویر کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسے ہی کسی جعل ساز نے مرتب کو فریب دے کر رقم ہتھیائی ہو۔

ان گزارشات کے ساتھ عبد الستار صدیقی صاحب، قاضی عبد الودود صاحب اور مسعود حسن رضوی صاحب جیسے بزرگوں سے درخواست ہے کہ اپنی گراں قدر رائے کا اظہار فرمائیں تاکہ کسی قطعی نتیجے پر پہنچا جا سکے۔

آخری دھڑکن

صلاح الدین نیر

نہیں یہ فکر کہ ہے کون وہ "گل تازہ"
جو میری "آخری دھڑکن" کا لفظ آخر ہے
مجھے یقین کہ اب تم کو کیا نہیں معلوم
میں کس کا نام لوں اپنا کہو تمہارا لوں
یا اس کا جو "گل تازہ" کی طرح مہکا ہے
خدا کا نام جو لیتا ہوں لوگ ہنستے ہیں
میں اپنا نام جو لیتا ہوں مسکراتے ہیں
تمہارا نام جو لیتا ہوں طنز کرتے ہیں
تمہیں بتاؤ کہ وہ کون ہے گل تازہ؟
مجھے تمہارے سوا کسے میرے غم کا اندازہ

جو نام برسوں سے ہونٹوں پہ پرورش پایا
وہ نام چھین لو آج میرے ہونٹوں سے
جو بات صدیوں سے سینے میں دفن ہے میرے
وہ بات تم کو بتانے سے کچھ نہیں حاصل
جو پھول پلکوں پہ میں نے سجائے رکھے تھے
وہ پھول اوروں کے دامن میں کیوں بکھر جاتے
جو خواب آنکھوں میں میں نے چھپائے رکھے تھے
وہ خواب میرے ہیں مجھ سے کبھی نہ چھینو تم
تم ایسے کون سے ہو رحم دل جو پاس آ کر
کبھی کبھی ہی سہی دل کے زخم دھوتے ہو
میں جیسا کچھ بھی ہوں جس حال میں ہوں چھوڑ دو
تڑپنے کرب کے عالم میں زہر پینے دو

تضاد

رحمٰن جامی

یہ جانی پہچانی راہیں
میرے قدم جن پہ جاتے ہیں
بھیڑ لگی ہے ان راہوں میں
شور قیامت کا برپا ہے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
ایسے میں کوئی دیوانہ
آ کر مجھ سے یوں کہتا ہے
شہر میں کتنا سناٹا ہے

اردو نہ غیر ملکی زبان ہے اور نہ ہندی کی ایک شیلی

دلی ۲۴ اکتوبر گجرال فورم سے متعلق کانگریس کے زیر اہتمام ایک اجتماع میں یہاں تعلیمی کمیشن کی سفارشات پر بحث ہوئی جس میں علاقائی زبانوں کو تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ اس سلسلہ میں بعض لیڈروں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا اور بعض نے عدم واقفیت کی بنا پر خیال ظاہر کیا کہ اردو غیر ملکی زبان ہے اور یہ تغلق اور مغل خاندانوں کے ساتھ ہندوستان آئی۔ بعض نے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ ہندی ہی کی ایک شیلی ہے۔ اس مباحثہ میں انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی جنرل سکریٹری محترمہ حمیدہ سلطان نے بھی حصہ لیا۔ آپ نے زبان کے متعلق گاندھی جی کے نظریہ کو یاد دلایا اور کہا کہ گاندھی جی کے کہنے پر اگر عمل کیا جاتا اور ہندوستانی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جاتا تو غیر ہندی علاقوں میں اس کی مخالفت اس طرح نہیں ہوتی جیسی کہ اب ہو رہی ہے۔ اگر اب بھی حکومت ہند ہندوستانی کو سرکاری زبان کا درجہ دے تو حالات یقیناً سدھر جائیں گے اور زبان کے متعلق جو ہنگامے ہوتے رہتے ہیں ختم ہو جائیں گے۔ سنسکرت آمیز مشکل ہندی کو ہندی والے خود بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ آل انڈیا ریڈیو جس زبان میں خبریں اور پروگرام ہوتے ہیں یہ لوگ اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ سہ لسانی فارمولا پنڈت جی نے اسی لیے رکھا تھا کہ ہندی اور علاقائی زبان کے ساتھ اردو کو بھی اس کا حق مل سکے۔ پرائمری تک مادری زبان میں اور سرکاری زبان میں تعلیم دی جائے اس کے بعد بچہ تیسری زبان اپنی مرضی سے جو چاہے پڑھے۔

یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت میں رکھا جائے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اردو ہندی کا ایک ادبی روپ ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو کے ہندو ادیب و شاعر اب بھی کافی موجود ہیں۔ اردو میں بیشک مسلمانوں کا کلچرل ورثہ ہے اس لیے مسلمان اس کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مغلوں کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ اس زبان کو شاہجہاں نے اردو کا نام دیا اور یہ بھی ایک خوبصورت تحفہ مغلوں کی جانب سے ہندوستان کے لیے جیسے تاج محل اور لال قلعہ۔ اردو باہمی رابطہ، محبت اور اخلاص کی نشانی ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اردو کا کوئی علاقہ نہیں۔ اردو بلا تفریق مذہب و ملت دلی کی زبان ہے۔ دلی کے لوگ سب اردو بولتے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ڈاکٹر تارا چند، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت سندر لال، چودھری برہم پرکاش یہ سب سیاسی رہنما اپنی مادری زبان اردو بتاتے ہیں۔ دلی اردو کی جنم بھومی ہے۔

اردو کو اس کا حق دلوانے کے لیے مسلمان اور ہندو ساتھ مل کر جدوجہد کر رہے ہیں۔ ابھی یو۔پی میں اردو والوں کا ایک وفد پنڈت آنند نرائن ملا کی قیادت میں مرکزی وزیر تعلیم سے ملا تھا۔ [illegible] اور سندر لال، آنند نرائن ملا اردو کے لیے رات دن دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی زبان کہہ کر اردو کے ساتھ ناانصافی کرنا بہت ناانصافی ہے۔

(الجمعیۃ)

ڈاکٹر سید سلیمان حسین

اسیر لکھنوی

(گذشتہ سے پیوستہ)

جس وقت یہ کتاب چھپ کر تیار ہوئی اور اسیر کی نظر سے گذری تو ان کو "نمک فراموش" کے لفظ پر نہایت رنج ہوا۔ اسیر نے ایک "عرضداشت" مندرجہ عبارت کے جواب میں روانہ کی جس میں انھوں نے بادشاہ کے لیے "خیرخواہ فراموش اور حضور اقدس کے دل نے میری نمک فراموشی کا مزہ خوب اٹھایا ہوگا" جیسے الفاظ استعمال کئے تھے۔

بدیہہ گوئی اسیر نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی اور بہت پرگو تھے صاحب تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا نے لکھا ہے کہ "ان کا کلام استاد کے کلام کے پہلو بہ پہلو ہے اور مشق سخن اس قدر ہے کہ دو شخص ان کی تصنیف کی برابری نہیں کر سکتے۔"

جملہ اصناف سخن پر قادر تھے، طبیعت کا زور ضخیم دیوانوں، ہزارہا اشعار کی مثنویوں اور صدہا سلاموں اور مرثیوں میں نہیں سماتا۔ حضرت داغ کا بیان ہے کہ "ان کا معمول تھا کہ رات کو سوتے وقت منشی صاحب (اسیر مرحوم) کے سرہانے کاغذ کی جتنیں کاٹ کر اور پلنگ کے پاس مونڈھے پر قلمدان رکھ دیا جاتا تھا وہ سو جانے سے پہلے کبھی ۳۰-۵۰ کبھی ۷۰ اور ۸۰ اور کبھی اس سے بھی زیادہ اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔"

"ایک بار زود گوئی اور روانی طبع کا ذکر تھا فرمایا لکھنے اور شعر موزوں کرنے میں برابر کا وقفہ ہوتا ہے حاضرین کو کچھ تامل ہوا، کتاب کا ایک صفحہ نقل کرنے کو دیا اور خود غزل کہنے لگے جب نقل کرنے والے نے کہا "میں تو لکھ چکا" آپ نے بھی کاغذ ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا "میں بھی کہہ چکا" دیکھا گیا تو ۲۰-۲۵ شعروں کی غزل مع مطلع و مقطع کے تیار تھی"

"ایک سپاہی کچھ لکھے پڑھے تھے اسیر مرحوم سے کہا آپ نے لوگوں کو دیوان کہہ دیئے مجھے آپ نے کبھی کچھ نہ کہہ دیا" فرمایا "تم دیکھتے ہو فرصت تو ملتی نہیں" انھوں نے کہا اگر آپ چاہیں گے تو میرا بھی دیوان ہو جائے گا" کچھ سوچ کے فرمایا "اچھا تم یہ کیا کرو کہ جب میں اٹیشنی جایا کروں تو پالکی کے ساتھ ہو لیا کرو" ان کے اس عمل سے دس پندرہ بار کے آنے جانے میں ان کا بھی پورا دیوان ہو گیا"[۱]

اسیر مرحوم دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر ہیں، ان کا رنگ سخن وہی ہے جو عام طور پر ان کے زمانہ میں پسند کیا جاتا تھا۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت کے وہ بھی اسیر ہیں لیکن خارجی بیانات اور رنگینیت ان کے کلام میں اپنے ہمعصروں کی بہ نسبت نہ ہونے کے برابر ہے، پرگوئی کے ساتھ ساتھ غضب کی روانی، شگفتگی اور کلام میں سلاست پائی جاتی ہے، مشکل اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال کا انھیں شوق نہیں، غزلیں بھی معاصرین کے مقابلہ میں مختصر ہوتی ہیں۔ کلام کا بیشتر حصہ بامزہ اور لطیف اشعار سے پر ہے۔

اسیر دریائے گومتی کے اس پار اپنے آباد کئے ہوئے محلے منشی گنج میں رہتے تھے جہاں ان کی کئی عالیشان عمارتیں اور دوکانیں وغیرہ تھیں ان کے علاوہ کئی مواضعات کے بھی مالک تھے۔ جائیداد ان کے بیٹوں کی زندگی ہی میں ختم ہو گئی تھی اب ایک مختصر سا مکان اور اٹیشنی میں کربلا باقی رہ گئی ہے۔

اسیر نہایت خلیق نیک نفس اور ملنسار شخص تھے خود نمائی ان میں نام کو نہ تھی ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے بہت جھک کر ملتے تھے، محبت اہلبیت میں ڈوبے ہوئے تھے، اپنے مکان پر ہر ماہ کی چودھویں تاریخ کو مجلس کیا کرتے تھے۔

منیر شکوہ آبادی کا بیان ہے کہ "۱۲۸۲ھ سے ۱۲۸۸ھ تک اسیر کے مکان پر ہر مہینہ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا لیکن وہ مشاعرہ صرف اعتراضات کے لیے مقرر تھا اور شرط یہ تھی کہ جو اس میں شریک ہو وہ "اعتراض" پر جانہ مانے بلکہ اعتراض کا معقول جواب دے کہ حریف اور سب سامعین کو سمجھا دے ورنہ جو اعتراض کیا گیا ہے اس کو قبول کرے" اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس وقت کے بڑے بڑے شعراء خوف سے نہ آتے تھے۔

آخر زندگی کی وہ بہاریں دیکھ کر سہ شنبہ ۱۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۷ فروری ۱۸۸۲ء کو دن میں ۲ بجے انھوں نے رحلت کی، امیر مینائی نے تاریخ وفات کہی، مصرعہ تاریخ یہ ہے ؎

سلطان سخن امام فن قبلہ من

۱۲۹۹ھ

تصانیف (۱) دیوان فارسی، گلشن نقش (۲) گلستان سخن جو ریاض مصنف (۳) گلدستۂ امانت (دیوان منقبت) (۴) دیوان اسیر (۶) دیوان قصائد

مثنویات مثنوی درۃ التاج (۲) مثنوی بطور شہادت نامہ (۳) مثنوی جس میں امین الدولہ نواب امداد حسین خاں بہادر وزیر اودھ کے زخمی ہونے کا حال لکھا ہے (۴) مثنوی سعادتنامہ (۵) مثنوی ریاض التسلیم (۶) مثنوی خلاصۃ التفویض، زر کامل عیار، شرح معیار الاشعار اور بہت سے رسالے علم عروض و قوافی کے اردو، فارسی اور عربی میں لکھے ہیں ان کے علاوہ امیر مینائی نے تذکرہ انتخاب یادگار (مطبوعہ ۱۲۹۰ھ) میں مرثیوں اور سلاموں کا بھی ذکر کیا ہے جس کا ایک حصہ قلمی صورت میں استاذی پروفیسر سید مسعود حسن صاحب ادیب کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

شاعری کا رنگ یہ ہے ؎

باقی ابھی ہے ترک تمنا کی آرزو کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں رہی

دل مجروح کو کیا دیکھئے آئے ہو بے پردہ
چھپا لو چہرہ دیکھو چاندنی پڑتی ہے بسمل پر

۱؎ امیر مینائی از ممتاز علی آہ ص ۱۳۳

جاتے ہی کہہ دوں گا میں مجرم ہوں تو رب کریم
سوچ رکھا ہے سوال روز محشر کا جواب
شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا   کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا
کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست
شراب پیر کی طاقت جواں رکھتی ہے
دوا مریض کو برسوں سنبھال رکھتی ہے
خدا دراز کرے عمر تیغ قاتل کی
کہ سب سے بڑھ کے ہمارا خیال رکھتی ہے
ہزاروں دہر میں طوفاں ہوں ڈوبتا نہیں میں
جزیروں پر مجھے گرد ملال رکھتی ہے
خیال گردن و چشم بت مستانہ آتا ہے
ہماری بزم میں یہ شیشہ یہ پیمانہ آتا ہے
شاید بساط دہر ہے شطرنج کی بساط
میں جس کو دیکھتا ہوں جدا اس کی چال ہے
اشک طوفاں اگر بپا کرتے   ناخدا بھی خدا خدا کرتے
تنگیٔ غم دل کو آخر باعث راحت ہوئی
اس قدر سمٹی پریشانی کہ جمعیت ہو گئی
چھین لے گا کیا بھلا ہم سے زبردستی کوئی
مفلسی بھی کیا کسی زردار کی دولت ہوئی
ذرا سی بات میں ہوتے ہیں اپنے بیگانے
بڑا کمال ہے اپنا کسی کو کر لینا
نبض بیمار جو اے رشک مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی
بغیر ختم ہوئے یار اڑ چلا نامہ
پکارتا ہی رہا میں کہ نامہ بر لینا
آج ساقی میں نہیں گو کہ مروت باقی
خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی
عجب طرح کی ہے مہمانی کہ دونوں جانب ہے میزبانی
خدا کے گھر میں جو آ کے بیٹھا اسی کے دل میں خدا کا گھر ہے
جدا امراز میں بیگانہ و یگانہ ہوا
نظر پلٹتے ہی کیا منقلب زمانہ ہوا
مستحق جب سے گیا عالم فانی سے امیر
ایک استاد نہیں کہنے کو استاد ہیں سب

شاگردان امیر امیر کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے ان میں سے اکثر صاحب دیوان اور بہت نام آور ہوئے ہیں۔

(۱) امیر نواب موزوں (۲) میر بندہ حسین ساقی (۳) میر علی جان درخشاں (۴) شیخ رمضان علی ابر (۵) میر الٰہی بخش نازش (۶) عبدالکریم خاں حماد (۷) شیخ تفضل حسین عزیز (۸) کاظم علی خاں کاظم (۹) امیر احمد امیر مینائی (۱۰) مہدی حسن خاں ماہر (۱۱) احمد علی شوق قدوائی (۱۲) محمد سلیمان خاں اسد (۱۳) منشی ظہور الحسن ظہور (۱۴) ریاض احمد ریاض خیرآبادی (۱۵) نواب یوسف حسین خاں طباطبائی یوسف (۱۶) منشی تفضل رسول خاں واصلی سندیلوی (۱۷) پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸) بہادر حسین خاں انجم (۱۹) اصغر علی خاں اصغر (۲۰) آغا حیدر افسر (۲۱) مظہر الحسن رامپوری (۲۲) محمد عبدالعزیز اعجاز (۲۳) شیخ محمد تائب (۲۴) شیخ الٰہی بخش تبسم (۲۵) مرزا محمد جعفر جعفر (۲۶) سید غضنفر علی حکیم (ابن امیر) (۲۷) علی حزیں حزیں (۲۸) سید علی خاں درخشاں (۲۹) ممتاز علی دل (۳۰) رضا حسین رضا (۳۱) نواب نیاز احمد خاں ہوش (۳۲) افضل شاہ خاں طوفان (۳۳) ظہور حسین ظہور (۳۴) عابد حسین عابد (۳۵) مہدی حسین عاقل (۳۶) احمد علی عاشق بریلوی (۳۷) میر امیر حسین فروغ (۳۸) قمر الدین فوق سندیلوی (۳۹) محمد عابد علی کوثر بیتاپوری (۴۰) لعل محمد لطیف (۴۱) منصب علی منصب (۴۲) سید محمد جان مضطر بریلوی (۴۳) نادر حسین نادر (۴۴) منظر علی خاں منظر (۴۵) میر مہدی حسین ماہر (۴۶) محمد سجاد علی سلطان (۴۷) آغا حسین نجیر (۴۸) ظفر علی ظفر۔

ان کے علاوہ بکثرت شاگردوں کے نام تذکروں میں ملتے ہیں جنھیں یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

صفحہ ۳ سے آگے

جاتا ہے کہ وہ فارسی اور اردو پر کافی عبور رکھتا تھا اور ان دونوں زبانوں میں شعر کہہ سکتا تھا فارسی ترجمے میں دیباچے کے بعد اصل قصہ شروع کرنے سے پہلے ایک صفحے پر حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

ترجمہ میمون، از زبان فرانسیسی در زبان فارسی برائے لاحظ
حضرت اقدس و علی ادام اللہ ملکہ و سلطانہ و اضعف اللہ
اقتدارہ و حشمتہ،

سایۂ ایزد تعالیٰ شاہ و شاہے کہ چرخ   مہر رابشنید را تا ئید قضا فرمان براست
چوں رواج دین احمد داد ہمچوں مرتضےٰ   زیں سبب نامش محمد یا علی حیدر است
خانہ زاد دیرینہ فورتیر قدیم دعا گو و جاں نثار،

اس عبارت کے نیچے فورتیر کے دستخط رومن حرفوں میں یوں ہیں

- Rfoo Tier

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فورتیر نے یہ نسخہ محمد علی شاہ کو نذر دینے کے لیے تیار کروایا تھا۔ اس کی شان بھی یہی کہتی ہے۔ اس کا کاغذ عمدہ ہے متن کی فارسی عبارت بہت پاکیزہ جلی نستعلیق خط میں ہے حاشیے کی عبارت جو خفی خط شکستہ میں ہے وہ بھی خوش خط ہے۔ فہرست صفحہ مطلا ہیں۔ باقی تمام صفحوں پر دوہری طلائی جدولیں ہیں۔

میر احمد اللہ خان

متنازع کہاں ہے؟

(ابو علی اعظمی صاحب کے جواب میں، بہ سلسلۂ ہماری زبان یکم ستمبر ۱۹۶۶ء)

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

آپ نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے مضمون "انسانیت موت کے دروازے پر" کو متنازع فیہ بنا دیا ہے۔ کیا آپ نہیں بتانا پسند کریں گے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہاں لکھا ہے کہ یہ مضمون میرا ہے یا ابوالکلام کے کسی معتقد نے اصرار کیا ہے کہ یہ سلسلہ مضامین مولانا ملیح آبادی کا نہیں مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے یا کسی محقق نے کوئی ایسا دعویٰ کیا ہے؟ اگر کسی ناشر کی جہالت سے یہ سلسلہ مضامین ابوالکلام آزاد کے نام سے چھپ گیا تو یہ مسئلہ متنازع کیوں کر بن گیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مضمون کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ آپ نے اسے متنازع فیہ بنا دیا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کا موضوع یہ تحقیق نہیں کہ "انسانیت موت کے دروازہ پر" کس کا سلسلہ مضامین ہے آپ کی بلا سے یہ مضمون ملیح آبادی کا ہو یا آزاد کا آپ کو اس سے غرض نہیں آپ نے اس تیر سے دوسرا شکار کرنا چاہا ہے اور اس مفروضہ کی بنیاد پہ آپ نے اپنی خواہش کا ایک اور قصر تعمیر کرنا چاہا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ "شہید اکبر" کے سلسلے میں ایک بحث چند سال پیشتر ایک بحث اخبار مدینہ بجنور میں مدتوں سے چلتی رہی تھی لیکن اس بحث کو بعدہ لکھنؤ اور دہلی وغیرہ کے بعض بزرگوں نے ختم کرا دیا تھا لیکن اب آپ نے یہ بحث از سر نو چھیڑ کر ابوالکلام کے معتقدین کو آزاد کر دیا اس کے لیے ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔

اگر آپ کے نزدیک یہ مضمون اب بھی متنازع فیہ ہے تو معارف میں مطبوعہ "اشاریہ سلیمان" میں اس مضمون کو سید صاحب مرحوم کا بتانا بد دیانتی اور غیر اخلاقی حرکت نہیں ہے؟ کیا متنازع فیہ ہونے کی صورت میں یہ ضروری نہ تھا کہ اس کے متعلق حاشیہ میں یہ تصریح کی جاتی کہ اس کی ملکیت کے بارے میں آزاد و سلیمان یا ان دونوں کے معتقدین میں اختلاف ہے۔ آپ نے اس مضمون کی ملکیت کو متنازع فیہ بتایا ہے لیکن افسوس کہ آپ کی اس رائے سے آپ کے حلقے کے صاحبان علم و نظر متفق نہیں ہیں۔

آپ نے اس بحث کو کس حیثیت سے چھیڑا ہے؟ کیا آپ ابوالکلام یا سید سلیمان ندوی میں سے کسی کے طرف دار ہیں؟ یا صرف تحقیق آپ کا مقصد ہے؟ اگر آپ سید صاحب مرحوم کے طرف دار ہیں تو کیا اس گروہ کے اہل الرائے حضرات کی حمایت آپ کو حاصل ہے؟ ابوالکلام کے معتقد اور طرف دار آپ بہر حال نہیں ہیں۔ اگر آپ کا مقصد صرف تحقیق اور جستجوئے حقیقت ہے تو میرا خیال ہے کہ اس بحث میں محمد یونس خالدی، محمد شعیب عمری اور بعض دیگر حضرات کے محققانہ مضامین کو نظر انداز کر کے دیانت داری اور محققانہ نقطۂ نظر کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اب جبکہ اس بحث کو ختم ہوئے یا ختم کرائے کئی برس گزر گئے تو آپ نے "ہماری زبان" میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ آپ تنازع کا تصفیہ نہیں چاہتے بلکہ اپنی رائے کا اظہار مقصود ہے۔ حالانکہ صرف اتنی بات کے لیے یہ مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمانے کی ضرورت نہ تھی اگر واقعی آپ سنجیدگی کے ساتھ چھیڑنا ہی چاہتے ہیں تو مناسب ہوگا کہ پہلے اس مسئلہ پر مولانا عبدالماجد دریابادی سے اپنی اس مراسلت کو شائع فرما دیں جو مختلف اوقات میں ہوتی رہی ہے۔ یہ مراسلت دلچسپ بھی ہوگی اور آپ کی رائے میں اس سے وزن بھی پیدا ہوگا۔

ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس چھیڑ چھاڑ کو شاہ معین الدین، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہم حضرات کی پوری پوری حمایت اور تائید حاصل ہے۔ ہمیں کچھ دکھ اس بحث سے اس لیے ہوا کہ ابھی "معارف" کے "اعتراف شکست" کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ پھر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی لیکن چونکہ خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی اس لیے کوئی شکایت نہیں۔ "ہماری زبان" نے اس مسئلہ میں ایک نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے گنجائش نکالی ہے مجھے امید ہے کہ دوسرے نقطۂ نظر کی اشاعت کے لیے بھی تنگیٔ داماں کی شکایت نہ ہوگی۔

(ابو سلمان شاہجہاں پوری)

خوشتر بلگرامی حیدر آبادی کا پتا

حیدر آباد کے ایک بزرگ خوشتر بلگرامی کا مجھے پتا درکار ہے اگر حیدر آباد کے کوئی صاحب توجہ فرمائیں تو میں شکر گزار رہوں گا اگر صاحب موصوف کی نظر سے یہ تحریر گزرے تو وہ خود مجھے یاد فرمائیں۔

ڈ اکبر علی خاں

(رام پور رضا لائبریری رام پور)

یہ شعر کس کا ہے

ہماری زبان کے ذریعہ مطلع فرمائیں کہ یہ شعر کس کا ہے؟

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

(محمد نعیم)

(یہ شعر حفیظ جون پوری کا ہے۔ ادارہ)

یوپی، بہار اور دلّی میں اردو کو اس کا مقام دینے کے لیے صدرِ جمہوریہ فرمان جاری کریں گے

نئی دلّی۔ ۱۴ اکتوبر (یو۔ این۔ آئی) جلد ہی صدرِ جمہوریہ ہند کی جانب سے ہند کے آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ایک فرمان کے جاری کیے جانے کا امکان ہے۔ جس میں بعض خاص علاقوں میں مخصوص مقاصد کے لیے اردو کو استعمال کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ جن مخصوص مقاصد کے لیے اردو کے استعمال کی اجازت ہوگی ان میں یو۔ این۔ آئی کے بقول پرائمری کی سطح پر ان بچوں کی اردو میں تعلیم کا انتظام جن کی مادری زبان اردو ہے اردو کو سرکاری فارموں کے اختیار کرنے کی اجازت اور حکومت کو اردو میں درخواستیں وغیرہ پیش کرنے کی اجازت شامل ہے۔

اگرچہ آئین کے تحت چودہ قومی زبانوں میں سے کسی کے بھی استعمال کی اجازت ہے مگر ان ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والی آبادی ہے اس آئینی مراعات پر عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔

یو۔ این۔ آئی نے لکھا ہے اگرچہ ریاستی حکومتیں اردو بولنے والے لوگوں کو سہولت فراہم کرنے سے متفق ہیں مگر ان کے ارادوں کا اظہار عمل کی صورت میں نہیں ہوتا۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ صدارتی فرمان میں جن ریاستوں کو شامل کیا جائے گا۔ ان میں یو۔ پی بہار اور دلّی کا مرکزی علاقہ شامل ہے۔ فرمان میں اس آئینی اعلان کے نفاذ کے لیے ضروری منظوری شامل ہوگی۔ (الجمعیۃ)

بیجاپور کے فوجی اسکول میں اردو داں طلبہ کا داخلہ

بنگلور ۲۴ اکتوبر۔ شمالی کرناٹک کے مشہور قومی کارکن مرزا مغل صاحب کی کوشش سے وزیرِ تعلیم نے بیجاپور کے فوجی اسکول کے حکام کے نام اس امر کا حکم نامہ جاری کیا ہے کہ بیجاپور سینک اسکول میں کنڑی انگریزی اور مرہٹی میڈیم کے علاوہ اردو میڈیم والے طلبہ کو بھی داخلہ دیا جائے اور گلبرگہ میں پرائمری ٹیچروں کے لیے ایک اردو ٹریننگ کالج قائم کیا جائے گا۔ (الجمعیۃ)

مرکز نے اردو کو علاقائی زبان قرار دیا تو ہم اس فیصلے کو بخوشی قبول کریں گے

فخرالدین علی احمد کو وزیر اعلیٰ بہار کی یقین دہانی

مرکزی وزیر فخرالدین علی احمد نے ۱۱ اکتوبر کو پٹنہ سے دہلی واپس روانہ ہونے سے پہلے بتایا کہ انھوں نے اردو کے سلسلہ میں تمام مطالبات وزیر اعلیٰ بہار کے سامنے رکھے اور ان کا رویہ ہمدردانہ پایا وزیر اعلیٰ نے مجھے بتا دیا ہے کہ کن مقاصد کے لیے اردو کو اس ریاست میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور دستورِ ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اگر صدرِ ہندوستان نے ان اغراض کے لیے اردو کو اس ریاست کی علاقائی زبان ہونے کا اعلان کیا تو ہم اس اعلان کو بخوشی تسلیم کریں گے مرکزی وزیر آبپاشی نے کہا ہمیں توقع ہے کہ جلد ہی اس قسم کا اعلان ہو جائے گا۔

ریاستی شاخ مدھیہ پردیش کے وفد کی وزیرِ تعلیم سے ملاقات

بھوپال۔ انجمن ترقی اردو کا ایک وفد مدھیہ پردیش کے وزیرِ تعلیم جناب نرسنگھ راؤ دکشت سے ملا۔ وفد نے برہانپور کے اردو و مراٹھی ٹیچرس ٹریننگ کالج میں پہلے سال کے داخلہ کے سلسلہ میں گفتگو کی برہانپور کے اس کالج میں جو مدھیہ پردیش میں اردو و مراٹھی اساتذہ کی ٹریننگ کا واحد کالج ہے، اس سال سے پہلے سال میں اساتذہ کے داخلے نہیں ہو سکے ہیں جس کی وجہ سے اساتذہ میں کافی بے چینی تھی اور یہ بھی افواہ گشتی کہ یہ کالج برہانپور سے منتقل کر دیا جائے گا۔ وزیرِ تعلیم سے وفد کی ملاقات کے وقت ڈائرکٹر صاحب تعلیمات بھی موجود تھے انھوں نے بتایا کہ ٹرینڈ ٹیچرس کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اور کئی ہزار ٹرینڈ ٹیچرس کو ابھی تک ملازمتیں نہیں مل سکی ہیں، اس لیے فی الحال ٹریننگ کے لیے مزید داخلے نہیں کیے جا رہے ہیں۔ البتہ اگر مرکز سے مالی امداد مل گئی اور نئے پرائمری اسکول کھولے گئے جن میں موجودہ ٹرینڈ ٹیچرس کو لگایا جا سکے تو پھر ٹریننگ کے لیے داخلے شروع کر دیے جائیں گے۔ آپ نے بتایا کہ کالج کو برہانپور سے تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وفد میں ریاستی انجمن ترقی اردو کے قائم مقام صدر جناب شرقی ۔۔۔ سابق وزیر جناب عبدالقادر صدیقی ایم۔ ایل۔ اے اور برہانپور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب اقبال نقیب شامل تھے۔

(۲)

مدھیہ پردیش کے ہائر سکنڈری امتحان کی اردو کتب "ادبی شیرازے" نثر و نظم، نئی نظمیں، کشمکش وغیرہ کئی سال سے نہیں مل رہی ہیں جس کی وجہ سے اردو کے طلبہ میں سخت بے چینی ہے اس سلسلہ میں ریاستی انجمن ترقی اردو کے قائم مقام صدر جناب شرقی صاحب نے بورڈ کے ذمہ داروں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اردو کتب کی فراہمی کا انتظام کریں یا پھر ان کو تبدیل کر کے ایسی کتب شامل نصاب کریں جو بہ آسانی مل سکیں۔ آپ نے سکنڈری بورڈ کے تحت انٹرمیڈیٹ عمر اسطا کورس میں اردو کو شامل نہ کیے جانے پر بھی افسوس ظاہر کرتے ہوئے اردو کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

(سید اقتدار علی سکریٹری مدھیہ پردیش ریاستی انجمن ترقی اردو بھوپال)

ریاستی شاخ مغربی بنگال کے جنرل سکریٹری کا توجہ نامہ وزیرِ تعلیم کے نام

۱۲ ستمبر کو "امرت بازار پتریکا" میں ایک اشتہار شائع ہوا تھا جس میں پبلک سروس کمیشن مغربی بنگال نے ایک گورنمنٹ مدرسے میں ہیڈ ماسٹر کے عہدہ کے لیے درخواستیں طلب کی تھیں۔ اس عہدہ کے لیے تعلیمی صلاحیت ایم۔ اے۔ و بی ٹی یا ایم اے ۔۔۔ کا حکم قرار دی گئی

ہے اور بی اے درجے تک فارسی کی صلاحیت مطلوب ہے۔ بظاہر یہ عہدہ صدر مدرس عالیہ کلکتہ میں پر کیا جانے والا ہے۔ اس عہدہ پر اب تک صرف اردو داں مقرر ہوتے آئے ہیں لیکن مذکورہ اشتہار سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر اردو داں ہیڈ ماسٹر کا تقرر بھی عمل میں آسکتا ہے۔ اسی خدشے کے پیش نظر انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے جنرل سکریٹری جناب ایم۔ اے مجید نے وزیر تعلیم مغربی بنگال کی توجہ اس امر کی جانب دلاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ کلکتہ مدرسہ میں ہمیشہ غالب اکثریت اردو داں طلبہ کی رہی ہے اور اب تک یہاں اردو داں ہیڈ ماسٹر ہی ہوتے آئے ہیں اس لیے آئندہ جو ہیڈ ماسٹر یہاں مقرر کیا جائے وہ اردو فارسی کا بھی ایم۔ اے ہو۔ فارسی کا ایم۔ اے ہونے پر ایسے امیدوار کے لیے یہ لازمی ہو کہ بی۔ اے تک اردو اس کا مضمون رہا ہو۔ سکریٹری موصوف نے وزیر تعلیم سے یہ بھی گذارش کی ہے کہ انجمن کی جانب سے ایک وفد کو ملنے کی اجازت دی جائے تاکہ تمام معاملات پوری وضاحت کے ساتھ ان کے سامنے پیش کیے جاسکیں۔

(محمد ادریس الحق۔ جائنٹ سکریٹری)

وکرم یونیورسٹی اجین کے شعبۂ اردو کی تحقیقی سرگرمیاں

وکرم یونیورسٹی اجین کے شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال میں اس شعبہ میں اردو ادب پر جتنا تحقیقی کام اب تک ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ۔ ۱۹۵۹ء ڈاکٹر سلیم حامد رضوی۔ آگرہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے

(۲) امیر مینائی۔ ۱۹۶۳ء ڈاکٹر ابو محمد سحر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔

(۳) شمالی ہند کی مثنویاں۔ ۱۹۶۳ء ڈاکٹر گیان چند جین ڈی۔ لٹ کی ڈگری مل چکی ہے

(۴) ادب لطیف۔ ۱۹۶۵ء ڈاکٹر عبدالودود۔ ڈگری مل چکی ہے

(۵) اختر شیرانی اور جدید اردو ادب ۱۹۶۶ء ڈاکٹر یونس حسنی ڈگری مل چکی ہے۔

مندرجہ ذیل موضوعات پر کام ہو رہا ہے۔

(۶) جدید شاعری کا اثر اردو کے مروجہ اصناف سخن پر۔ عبدالباقی (جاورہ)

(۷) شعرائے اردو کے تذکرے۔ حنیف نقوی (بھوپال)

(۸) اردو شاعری میں سیاسی شعور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک احتشام الدین فاروقی (بھوپال)

(۹) اردو شاعری میں عورت کا تصور۔ مرزا شبیر بیگ (بھوپال)

(۱۰) ریختی کا تنقیدی مطالعہ۔ خلیل احمد صدیقی مہو (اندور)

(۱۱) مہدی افادی۔ آفاق احمد (بھوپال)

(۱۲) حسرت موہانی۔ عبدالقوی دسنوی (بھوپال)

(۱۳) مصطفیٰ خیرآبادی۔ سعید سلمی (بھوپال)

رجسٹریشن کے لیے درخواست کی جاچکی ہے

(۱۴) ریڈیو ڈرامہ کا فن۔ اخلاق اثر (بھوپال)

(۱۵) قرآن کریم کا اثر اردو شاعری پر۔ محمد حنیف انصاری (بھوپال)

(ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صدر شعبۂ اردو (وکرم یونیورسٹی اجین) گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال)

تقریبات یوم زور

دبستان دکن کے مایۂ ناز نقاد، دکنیات کے محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانی ادارہ ادبیات اردو و ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی چوتھی برسی کے موقع پر ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام چہار روزہ یوم زور کی تقاریب منعقد کی گئیں۔

۲۴ ستمبر کو ایوان اردو کے آڈیٹوریم میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، سیاسی اور سماجی قائدین، جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ صاحبان اور اردو دوستوں کے اجتماع میں افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی۔ معتمد یوم زور جناب میر سراج الدین علی خاں نے اس تقریب کے انعقاد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

جناب سید علی اکبر نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ "زور مرحوم کے بعد ادارہ خاموشی اور خلوص کے ساتھ ان علمی، ادبی اور ثقافتی فرائض کو بحسن وخوبی انجام دے رہا ہے۔ جو مرحوم کو عزیز تھے اور جن کے لیے ڈاکٹر زور نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔"

جناب رحمٰن راج سکسینہ نے یوم زور کے سلسلے میں آئے ہوئے پیامات سنائے۔

ان تقاریب کے سلسلے میں جن حضرات نے پیامات بھیجے ان میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن، وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند، مرکزی وزیر [illegible] جناب فخر الدین علی احمد، ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد صادق، جناب ہمایوں کبیر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر تارا چند، پدما بھوشن میر اکبر علی خاں بیرسٹر، جناب فضل الرحمٰن پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر سید احتشام حسین، مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کے معتمد عمومی پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جناب نثار احمد فاروقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

پیامات کے بعد جناب صلاح الدین نیر نے اپنی نظم "آخری آنسو" ترنم سے سنائی۔

جناب عبدالوحید خاں ناظم ریاستی آثار قدیمہ نے ڈاکٹر زور کی شخصیت اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی

مرزا شکور بیگ صاحب نے "نذرِ زور" کے عنوان سے اپنی نظم سنائی۔

ڈاکٹر غلام عمر خاں ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ نے اپنی فاضلانہ تقریر میں بتایا کہ ڈاکٹر زور مرحوم کی زندگی بیسویں صدی میں دکن کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز محقق اور نقاد تو تھے ہی، لیکن ان کا وہ کارنامہ انھیں اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے گا یہ ہے کہ انھوں نے دکن کے ایسے سیکڑوں شاعروں اور مصنفوں کو دوبارہ زندگی بخشی جن کے کارنامے طاقِ نسیاں کی نذر ہوگئے تھے۔ دکھنی ادبیات کی بازیافت کو ایک تحریک اور ایک مہم کی حیثیت سے شروع کرنے کا سہرا ڈاکٹر زور ہی کے سر ہے۔

بین کلیاتی زور یادگاری تحریری مقابلے کے کنوینر ڈاکٹر غلام عمر خاں نے مقابلے میں انعام پانے والوں کے ناموں کا اعلان کیا اور صدر جلسہ نواب مہدی نواز جنگ نے سید مجیب الدین طالب علم اورنگ آباد کالج کو انعام اول۔ محی الدین حسین طالب علم وشری کالج کو انعام دوم اور اسلم فرشوری طالب علم انوار العلوم کالج کو انعام سوم عطا کیا۔

پدما بھوشن نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے صدارتی تقریر فرمائی اور بتایا کہ "آج کا یہ جلسہ محبت، خلوص اور ڈاکٹر زور کی یاد کو تازہ کرنے والا جلسہ ہے۔ زور صاحب بڑے عملی انسان تھے، انھوں نے اردو زبان و ادب کے لیے مثالی خدمات انجام دیں۔ وہ بڑی خوبیوں اور کردار کے آدمی تھے۔ ان کی تمام تمنائیں ان کی زندگی میں تکمیل کو پہنچیں، اس طرح وہ خوش نصیب بھی تھے۔ ایوان اردو ان کے خیالات کا ترجمان اور دکن کی ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ ان کا ادارہ زبردست ادارہ ہے اور وہ بڑے انسان تھے۔ ادارہ کے قیام کے لیے زور صاحب نے جن نامساعد حالات میں اپنا کام کیا ہے اور اسے آج اس منزل پر پہنچایا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔

جناب سراج الدین علی خاں صاحب معتمد یوم زور نے شکریہ ادا کیا اور افتتاحی اجلاس برخاست ہوا۔

۵ ؍ ستمبر ایوان اردو کے اردو میوزیم میں آثار و تصانیف زور کی نمائش کا افتتاح جناب پی۔ این گپتا سابق معتمد تعمیرات حکومت آندھرا پردیش نے کیا۔ نمائش کے کنوینر جناب عبدالوحید خاں ناظم آثار قدیمہ نے نمائش کی تفصیلات سے واقف کرایا۔

نمائش کے افتتاح کے بعد ریاستی معتمد فینانس جناب مجاہد علی صاحب عباسی کی صدارت میں یوم زور کے سلسلے کا ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ جناب میر حسن معتمد ادبی اجلاس نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کیا۔ اس جلسہ کا آغاز ڈاکٹر زور کی ایوان اردو کے افتتاح کے موقع پر کی گئی خیر مقدمی تقریر کے ریکارڈ سے ہوا۔

جناب وقار خلیل نے اپنی نظم "یادِ زور" سنائی۔

جناب بھارت چند کھنہ نے ڈاکٹر زور کی شخصیت اور ان کے کارناموں اور دینی رجحانوں کا شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا۔

جناب کھنہ صاحب کی دلچسپ اور اثر انگیز تقریر کے بعد جناب ضیاء الدین احمد شکیب نے اپنا مقالہ "تاریخ اردو میں ڈاکٹر زور کی شخصیت کا تعین" سنایا۔

مقالے کے بعد نواب میر یٰسین علی خاں نے "ایک خواب" کے نام سے اپنی نظم سنائی۔

ڈاکٹر انور معظم نے "ہم بہرحال ایک دن، ایک سوال" کے زیر عنوان مضمون پڑھا جس میں ڈاکٹر زور کے مشن کو آگے بڑھانے پر زور دیا۔

پروفیسر سید محمد نے "چند باتیں، چند یادیں" کے زیر عنوان تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی یورپ سے واپسی کے بعد شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے وابستگی اور جامعہ کے ماحول کے بارے میں دلچسپ باتیں بتائیں اور ادارۂ ادبیات اردو کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر سید محمد کی تقریر کے بعد جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی تقریر میں زور صاحب کے لسانی کارناموں کا شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا اور ان کی شخصیت کے بارے میں بتایا کہ "ڈاکٹر زور کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک ادبی قائد تھے، خود لکھا اور دوسروں سے لکھوایا، تحریکیں چلائیں، اردو کے لیے سینہ سپر ہوئے اور آخر کار اردو کے لیے جاں بحق ہوگئے۔ دکنی اردو کے سلسلے میں ان کی دلچسپی ایسے ماحول میں پیدا ہوئی جبکہ حیدرآباد میں وحید الدین سلیم اور عبدالحق کے سبب ایک تہذیبی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر زور کی دکن پرستی کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ "پروفیسر زور نے اپنی لسانیاتی تحقیق کا آغاز "اردو شہ پارے" سے کیا اور اس کا ادبی عنوان دکھنی ادبیات پر ہوا۔"

صدر جلسہ مولوی مجاہد علی عباسی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ادارہ سے اپنی وابستگی اور ڈاکٹر زور کی خدمات اور ان کے مشن پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "ڈاکٹر زور نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آخر وقت تک اردو کی خدمت کے لیے خود کو وقف کردیا تھا اور اسی جذبۂ خدمت کے تحت کشمیر کا سفر کیا تھا۔ ان کی حیات کے زمانے میں اردو زبان و ادب کا بہت سا کام اسی ادارہ کے زیر اہتمام ہوا کرتا تھا اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کام کو پھر سے پوری اسپرٹ اور مخلصانہ جذبہ کے ساتھ شروع کیا جائے۔"

جناب میر حسن معتمد ادبی اجلاس کے شکریہ پر یوم زور کا جلسۂ مقالات ایک بجے دوپہر اختتام کو پہنچا۔

اسی روز رات کے ساڑھے نو بجے ایوان اردو کے سبزہ زار سے مشرقی طرز کے آڈیٹوریم میں ممتاز شاعر جناب مخدوم محی الدین کی صدارت میں غیر طرحی مشاعرہ شروع ہوا۔ معتمد مشاعرہ محترمہ عالیشان شاد نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مشاعرہ کا آغاز ڈاکٹر زور کے کلام سے ہوا۔ اس کے بعد صدر مشاعرہ

مخدوم محی الدین نے اپنی غزل سے مشاعرہ کی کارروائی شروع کی اور پھر حیدرآباد کے قدیم و جدید مکتب خیال کے شعراء نے نظمیں، غزلیں اور رباعیات سنائیں۔

۲۹ر ستمبر کی شب ساڑھے نو بجے ایوان اردو میں محفل سماع زیر صدارت جناب سید شاہ تقی الدین قادری منعقد ہوئی جس میں مشہور موسیقار عزیز احمد خاں وارثی اور ان کے ساتھیوں نے سازوں پر نعتیہ کلام پیش کیا۔ مشاعرہ اور قوالی کی ریڈیائی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہوئی اور یوم مخدوم کی یادگار تقاریب نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچیں۔ (وقار خلیل)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام یوم سرسید

علی گڑھ، ۱۷ر اکتوبر۔ سال گذشتہ کی طرح امسال بھی انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو کے زیر اہتمام یوم سرسید منایا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب محمد فضل الرحمن پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی۔ سکریٹری نے گذشتہ جلسے کی رپورٹ پڑھی۔ فضل الرحمن صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سرسید کی عظیم شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کسی ایک مختصر تقریر میں مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اس لیے میں سرسید کے افکار، ان کے مقاصد اور ان کی تحریک کی بنیادی اقدار سے بحث نہ کرتے ہوئے ان تاریخی اور سیاسی عوامل کی طرف اشارہ کروں گا جن کے بطن سے سرسید اور ان کی تحریک پیدا ہوئی۔ ملک کے اندرونی انتشار سے فائدہ اٹھا کر اور ۱۸۵۷ء کی دور انگیز تحریک آزادی کو دبا کر جب انگریز ہندوستان پر سیاسی طور پر قابض ہو گئے تو انھوں نے ذہنوں کو مسخر کرنا شروع کیا۔

سرسید چونکہ بے پناہ بصیرت کے مالک تھے اسی لیے انھوں نے اس کا اندازہ کر لیا کہ اب انگریزوں سے تلوار کے ذریعہ جنگ نہیں کی جا سکتی ہاں جدید تعلیم اور سائنسی نقطۂ نظر اپنا کر آزادی دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ مسلمان انگریزوں کے علم و ہنر کی وجہ سے ان سے اس درجہ بدظن تھے کہ ان کی تہذیب، ان کی تعلیم غرض ہر اس چیز سے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح انگریزوں سے تھا نفرت کرنے لگے تھے۔ مسلمانوں کا یہ جذبہ غیر فطری نہ تھا۔ اس لیے میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو سرسید کے مخالفین کو رجعت پسند یا روایت پرست کہہ کر ان کی تحقیر کرتے ہیں۔ سرسید نے اپنوں اور غیروں کی تمام مخالفتوں کا بڑی ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور وہ کچھ کر دکھایا جو آج بھی بہت زیادہ دشوار نظر نہیں آتا لیکن آج سے سو سال پہلے اس کو سرانجام دینا ایک معجزہ تھا۔ سرسید کے افکار اور کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے بالا تھے۔ سرسید کی یاد آج ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ آج ہمیں بعض ایسے ہی مسائل درپیش ہیں جو سرسید کو پیش آئے تھے لیکن آج وہ حل قابل قبول نہیں ہے جو سرسید نے ایک خاص تاریخی موڑ پر پیش کیا تھا، بلکہ زمانے کی ضرورت اور وقت کے مزاج کو سمجھتے ہوئے نئی نسل کو مستقبل کے لیے ہر طرح سے تیار کرنا ہے جس کی طرف ہمیں بڑھنا ہے۔ قدامت اور جدت، روایت اور بغاوت کے درمیان آج بھی جنگ ہو رہی ہے۔ اس لیے ہمیں بہت محتاط ہو کر اپنی منزل اور راستہ کا انتخاب کرنا ہے۔ سرسید جیسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ انھوں نے جس طرح اس درسگاہ کے دروازے ہمیشہ ہر فرقہ اور ہر طبقے کے لیے کھلے رکھے ہمیں بھی اس کا خیال رکھنا ہے کیونکہ علم کی ضرورت ہر فرقہ اور ہر طبقہ کو ہے۔

فضل الرحمن صاحب کی تقریر کے بعد شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر اصغر عباس نے "مسلم یونیورسٹی گزٹ کی روشنی میں سرسید کی صحافت" کے عنوان سے ایک مختصر مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے نہ صرف سرسید کی صحافت کا جائزہ لیا بلکہ انیسویں صدی کی ہندوستانی صحافت کے پس منظر میں اس کی اہمیت اور افادیت کو نمایاں کیا۔ اصغر عباس کے مقالے کے بعد اشفاق محمد خاں متعلم پی ایچ ڈی نے سرسید کی ایک فارسی غزل ترنم کے ساتھ پیش کی۔ بعد ازاں جناب مسعود علی ذوقی استاد شعبۂ اردو نے سرسید کا مشہور انشائیہ "گذرا ہوا زمانہ" اپنے مخصوص و منفرد ڈرامائی انداز سے سنایا۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور نے مختصر تقریر کی۔ موصوف نے کہا کہ ابھی چند دن پہلے میں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے شملہ گیا تھا۔ اس سیمینار کا موضوع "جدیدیت اور معاصر ہندوستانی ادب" تھا۔ میں نے بھی اس میں ایک مقالہ پڑھا جس میں میں نے آرنلڈ کی جدیدیت کی تعریف کے اس پہلو پر خاص زور دیا تھا جس کو وہ "تنقیدی روح" کہتا ہے۔ یہ تنقیدی روح ماضی کی نفی نہیں کرتی بلکہ حال سے اسے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کو تنقیدی نظر سے دیکھتی ہے کیونکہ اس ہم آہنگی یا مطابقت کے بغیر مستقبل کی طرف بڑھنا ممکن نہیں۔ جامد اور بے روح زندگی میں چہل پہل اسی تنقیدی روح سے پیدا ہوتی ہے۔ میں نے سیمینار کا تذکرہ اور آرنلڈ کے نقطۂ نظر کا حوالہ یہاں اس لیے دیا کہ میرے خیال میں سرسید کی تمام تہذیبی، علمی، تعلیمی، ادبی، اصلاحی مقاصد اور خیالات کی بنیاد یہی تنقیدی روح ہے۔ آج ۱۹۹۶ء میں بھی اس تنقیدی روح یا نظر کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ سرسید کے زمانہ میں تھی۔ سرسید جیسی جامع حیثیات شخصیت کا احاطہ اور ان کے افکار کا جائزہ کسی مختصر تقریر میں ممکن نہیں اس لیے میں ان کی تنقیدی روح کے صرف دو عنوانات کی طرف اشارہ کروں گا۔ پہلا عنوان ان کا فکری نظام ہے۔ ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے بلند آدرشوں اور اعلیٰ روحانی قدروں کی کارفرمائی رہی ہے لیکن یہ اعلیٰ روحانی قدریں اور آدرش کچھ مخصوص لوگوں اور اداروں سے وابستہ رہے ہیں اور عوام تک ان کی پہنچ نہ ہو سکی بالکل اسی طرح جس طرح پہاڑ کی چوٹی سورج سے حرارت بھی حاصل کرتی ہے اور روشنی بھی لیکن وادیاں برفیلی اور تاریک رہتی ہیں۔ مغرب کے اثر سے ہندوستان میں ہر سطح پر انقلاب آیا۔ ہمارے یہاں اس سے پہلے سوفسٹی کیٹڈ پروگریسیو ذہن تھا لیکن مغرب کے اثر سے اس سمت میں ہندوستان نے آگے قدم بڑھایا۔ مغرب کے اثر سے جو ذہن پیدا ہوا وہ اس انسان دوستی سے خاصا مختلف تھا جو ہمارے یہاں پہلے سے موجود تھا۔ ہماری انسان دوستی میں مادہ سے زیادہ کچھ تھا ارضیت کم۔ اس نے تعصبات کی دلدل اور توہمات کی تاریکی سے نکال کر ہمیں عقلیت اور سائنسی طرز فکر سے آشنا کیا۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب نے مشرق کو نقصان پہنچایا۔ سرسید نے تعلیم، معاشرت، سیاست تمام شعبہ ہائے زندگی میں جدید طرز فکر سے ایک نئی روح پھونک دی۔ پیرایۂ اظہار کے لحاظ سے بھی سرسید نے بڑے کارنامے نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے اردو کے محلی لکھنے کے بجائے زبان کے چلن کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ زبان کو زیور، نقاب یا لباس کچھ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک ایسا آئینہ سمجھتے تھے جس میں ہر چیز واضح اور صاف نظر آئے۔ ان کے خیال میں پیرایۂ اظہار کی خوبی یہ ہے کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ وہ معنی اور مفہوم کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ وہ زبان کی سادگی اور خیال کی وضاحت کے قائل تھے۔ اقبال کا ایک شعر ہے:

حقیقت کی مراحل ہو کر ہی کا اسلوب شمشیر کی مانند ہو تیزی میں اور ہے

سرسید کے یہاں اظہار کا یہی تصور تھا۔ انھوں نے آزاد کو یہ بتایا کہ صرف جزئیات کے بیان سے اچھی شاعری پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں تخلیقی جوہر بھی ہونا چاہیے۔ ان کے مضامین میں بیشتر جگہ ایک لطیف کیفیت ملتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تخیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ جذبات کی فراوانی بھی ہے۔ ہر دور میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ماضی کے شاہ پاروں کا جائزہ لیا جائے اور ان کے زندہ عناصر کو اپنی شخصیت میں جذب کر کے انسان مستقبل کی طرف بڑھے۔ سرور صاحب نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ سرسید پر اقبال کے الفاظ صادق آتے ہیں:

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

سکریٹری کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام ہوا۔ (خدیجہ عبداللہ سکریٹری)